التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

پروفیسر علی محسن صدیقی

ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

Ali Mohsin Siddique (1929-2012) was a renowned scholar and historian of Pakistan. Beside three books and more than fifty research articles, he has translated seven books from Arabic/Persian/English into Urdu. These books are mainly on aqaid i.e. dogmatic theology and its historical development. In this paper I am trying to evaluate Ali Mohsin Siddique as a historian, with special reference of his translation work.

اسلامی تاریخ کا مضمون جتنا وسیع، عمیق اور اہم ہے، پاکستان میں اس کے ماہرین کی تعداد اتنی ہی کم ہے۔ تخصص کے اس دور میں اسلامی تاریخ کی متعدد شاخیں کی جا سکتی ہیں مثلاً مسلمانوں کی سیاسی تاریخ، علمی تاریخ، ادبی و فنی تاریخ، سماجی و ثقافتی تاریخ، عقائد اور فرقوں کی تاریخ، عسکری تاریخ، انتظامی تاریخ وغیرہ وغیرہ۔ اسلامی تاریخ کے ۱۴۰۰ سالوں کا احاطہ سیاسی خانوادوں کے حوالے سے بھی کیا جاتا ہے مثلاً اموی دور کی تاریخ، خلفاء بنو عباس کا دور، فاطمی دور خلافت اور عثمانی ترکوں کا دور وغیرہ۔ قرون کے حوالے سے بھی اسلامی تاریخ کی درجہ بندی کی گئی ہے مثلاً قرن اولیٰ (صدر اسلام) کی تاریخ، قرن وسطیٰ کی تاریخ یا عہد جدید کی تاریخ وعلیٰ ھذا القیاس۔ اس بحر ناپیدا کنار کے ماہرین خال خال ہیں اور یہ مضمون کم سے کم پاکستان کی حد تک قحط الرجال کا شکار رہا ہے۔ اس کم مائیگی کا احساس اس وقت اور بڑھ گیا جب ۱۴؍ جنوری ۲۰۱۲ء کو علی محسن صدیقی صاحب بھی ۸۳ برس کی عمر میں چل بسے۔

میری خواہش پر ایک بار علی محسن صدیقی صاحب نے اپنی زندگی کے بارے میں ایک شذرہ "سن کر ....." لکھا تھا یہ قلمی شذرہ جس پر ۱۳؍ اکتوبر ۲۰۰۹ء کی تاریخ پڑی ہے، میرے پاس محفوظ ہے، اس کے مطابق علی محسن صدیقی اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

> "میں ۱۹۲۹ء میں یوپی (ہندوستان) کے شہر غازی پور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مشرقی یوپی کی مشہور درس گاہ "چشمۂ رحمت اورینٹل کالج" میں داخل ہوا۔ اس کالج میں عربی، فارسی اور اسلامی علوم کی تعلیمات کے علاوہ جدید علوم اور انگریزی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ میں اس ادارہ میں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۸ء تک زیر تعلیم رہا اور عربی و فارسی درسیات کی تکمیل کی اور درس نظامی کے فاضل کی سند حاصل کی۔ صوبۂ یوپی کے عربی و فارسی امتحانات یعنی کامل ادب فارسی، عالم، فاضل ادب عربی اور فاضل دینیات کی اسناد حکومت یوپی سے حاصل کیں اور تمام امتحانات میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوا۔ بعد ازاں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے۔ ۱۹۴۹ء میں

مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ کی جانب ہجرت کی اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کا امتحان امتیازی نمبر سے پاس کیا۔ ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ سے کراچی ہجرت ثانیہ کی۔ یہاں ریڈیو پاکستان اور حکومت پاکستان کے بعض دفاتر میں ملازمت کی اور اس کے دوران میں نے کراچی یونیورسٹی سے اردو، عربی اور اسلامی تاریخ میں ایم۔اے کی اسناد حاصل کیں۔ آخر الذکر دو مضامین میں اول بدرجہ اول رہا۔ اس کے بعد اردو کالج میں اسلامی تاریخ کا لیکچرار مقرر ہوا اور کئی سال تک یہاں خدمت انجام دینے کے بعد کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامی تاریخ میں لیکچرار ہوا۔ کراچی یونیورسٹی میں لیکچرار، اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر رہا اور ۱۹۹۱ء میں پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی سے ریٹائر ہوا۔ع

یادش بخیر! جنوری ۱۹۷۵ء میں جب میں نے شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی میں بی اے آنرز سال اول میں داخلہ کے لئے درخواست دی اس وقت صدیقی صاحب صدر شعبہ تھے۔ داخلہ فہرست میں، جو اس زمانے میں شعبہ کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کی جاتی تھی، اس میں میرا نام نہیں تھا، یہ میرے لئے سخت تعجب کی بات تھی کیونکہ ایف ایس سی میں میری فرسٹ ڈویژن تھی، کراچی یونیورسٹی میں دو شعبوں میں داخلے کے لئے فارم بھرا تھا، ایک بائیوکیمسٹری اور دوسرے تاریخ اسلام۔ بائیوکیمسٹری کی داخلہ لسٹ میں میرا نام موجود تھا لیکن اسلامی تاریخ میں میرا داخلہ نہیں ہوا تھا۔ میں اپنے معاملے کی تحقیق کے لئے صدر شعبہ سے ملنے گئی، یہ علی محسن صدیقی سے میری پہلی ملاقات تھی۔

’’جی آپ کا کیا مسئلہ ہے؟‘‘

’’سر میرا نام داخلہ فہرست میں نہیں ہے‘‘

’’تو کیا تھرڈ ڈویژن آئی تھی؟‘‘

’’جی نہیں۔۔۔ ڈویژن تو فرسٹ ہے‘‘

’’تو پھر داخلہ کیوں نہیں ہوا؟‘‘ یہ کہتے ہوئے انھوں نے داخلہ فارم کا پلندہ اٹھایا، میرا نام پوچھا، میرا فارم تلاش کر کے اسے بغور دیکھتے رہے اور پھر کہا، ’’بی بی آپ نے فارم پر اپنے دستخط نہیں کئے ہیں‘‘۔

یہ وہ حماقت تھی جس کی مجھ سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی۔

’’سر اگر اب کر دوں۔۔۔؟‘‘

’’آپ نے کہیں اور بھی اپلائی کیا ہے؟‘‘

’’جی سر بائیوکیمسٹری میں‘‘

’’تو کیا رہا؟‘‘

’’وہاں ایڈمیشن ہو گیا ہے‘‘

’’تو پھر تو ظاہر ہے کہ تم وہیں جاؤ گی۔۔۔ تم نے ایف ایس سی کیا ہے تم پری میڈیکل کی طالبہ ہو‘‘

’’جی نہیں سر میں اسلامک ہسٹری پڑھنا چاہتی ہوں‘‘

انھوں نے پہلی بار سر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا پھر فارم میرے سامنے رکھ دیا، میں نے فارم پر دستخط کر دیئے اور شعبہ اسلامی تاریخ میں میرا داخلہ ہو گیا۔

شعبہ میں علی محسن صدیقی صاحب کی بڑی دھاک تھی، طلبہ و طالبات ان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ آنرز کے ابتدائی دو سال تو ہم ان کی تدریس سے محروم رہے۔ جب میں آنرز تھرڈ ایئر میں آئی تو صدیقی صاحب ہمیں ’’بنوعباس‘‘ کا مضمون پڑھاتے تھے۔ ان کے علاوہ ہمارے کئی اساتذہ اور بھی تھے لیکن صدیقی صاحب ایک ودیا ساگر تھے، شعبے کے یہ واحد استاد تھے جو کلاس میں کسی نوٹس وغیرہ کے بغیر آتے تھے، لیکچر دینے کا انداز انتہائی سنجیدہ، باوقار اور علمی تھا۔ کلاس میں کسی قسم کی بدتمیزی اور گڑبڑ برداشت نہیں کرتے تھے۔ نالائق طالب علموں کے لئے بہت سخت تھے لیکن اچھے طالب علموں کے لئے پدر

مہربان سے کم نہیں تھے۔ ایم اے فائنل میں وہ ہمیں "جدید دنیائے اسلام" کا مضمون پڑھاتے تھے۔

ستمبر ۱۹۸۷ء میں میں بحیثیت کوآپریٹیو ٹیچر کے شعبہ اسلامی تاریخ سے وابستہ ہوئی تو چند ماہ بعد ہی علی محسن صدیقی صاحب شعبہ معارف اسلامیہ میں پروفیسر مقرر ہو کر چلے گئے، تاہم ہمارے شعبہ میں ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ دوران طالب علمی میں بھی وہ مجھ سے چھوٹے موٹے علمی کام لیتے رہتے تھے، ان سے علمی رابطہ برابر قائم رہا، وہ مجھ سے کچھ نہ کچھ لکھواتے رہتے تھے، مجھے یاد ہے ایک بار انہوں نے مجھے امام اوزاعی پر لکھنے کو کہا، میں نے ۱۷ فروری ۱۹۸۷ء کو یہ مضمون انہیں لکھ کے دیا، انہوں نے پسند کیا لیکن ساتھ ہی نصیحت کی کہ عربی کی استعداد بڑھانی ہوگی تاکہ اس سے بہتر مضمون لکھا جاسکے۔

وہ برابر مجھ سے علمی رابطہ رکھتے تھے، بعض اوقات استاد ہونے کا فائدہ بھی اٹھاتے تھے مثلاً یہ واقعہ میرے ذہن میں ہے، فروری ۱۹۸۷ء کی بات ہے، وہ بریگیڈیئر گلزار احمد کی کتاب "حدیث دفاع" کی تلاش میں تھے، میں نے انہیں بتایا کہ یہ میرے ابو (ڈاکٹر افتخار احمد۔ م ۳/ جون ۲۰۰۵ء) کے کتب خانے میں ہے، حکم ہوا فوراً کتاب حاضر کی جائے، میں نے اگلے ہی دن کتاب سر کی خدمت میں پیش کردی، انہوں نے کتاب کی فوٹو کاپی کرائی، جلد بندی کروا کے مجھے بھجوادی اور اصل نسخہ اپنے پاس رکھ لیا۔

تیرے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے

شعبہ میں میری تقرری سے بہت خوش تھے، مجھے ان کا وہ خیر مقدمی جملہ اب تک یاد ہے جو انہوں نے ڈاکٹر محمد صابر (اس وقت کے صدر شعبہ) کے کمرے میں کہا تھا "میں نگار اور شکیل کے شعبہ میں تقرری سے بہت خوش ہوں اور اب مجھے شعبہ کے مستقبل کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہے"۔ ایک ایسے استاد کے منہ سے جو کم ہی کسی کی تعریف کرتا ہو یہ جملے کسی اعزاز سے کم نہیں تھے۔ انہوں نے اسی طرح کی بات اپنی تالیف الصدیق کے مقدمے میں بھی لکھی ہے۔ ؏

اسلامی تاریخ کے مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی اور فارسی زبان سے نہ صرف واقف ہو بلکہ اس پر عبور بھی رکھتا ہو۔ صدیقی صاحب کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا، انہوں نے فارسی کی انتہائی مشکل کتاب تاریخ جہاں کشائی کا اردو ترجمہ کر کے اپنی فارسی دانی کا سکہ بٹھا دیا تھا، انہوں نے عقائد کی چند اہم ترین کتابوں مثلاً الفرق بین الفرق، الملل و النحل اور عقائد مسلمین ومشرکین کو سبقاً سبقاً پڑھا تھا، اسی طرح کتب حدیث خصوصاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور کتاب الموطاء کو بھی سبقاً سبقاً پڑھا تھا جس نے ان کے علمی کینوس کو وسیع کیا اور واقعات کے تجزیات میں انہوں نے اپنے علم سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس تبحر علمی نے ان میں وہ اعتماد اور خیالات میں وہ وسعت پیدا کی جس نے واقعتاً صاحب نظر بنادیا۔

مجھے یاد ہے جامعہ کراچی میں اپنے شعبہ کے اساتذہ سے صدیقی صاحب مختلف موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اپنی گفتگو میں عموماً بڑے سنجیدہ اور باوقار تھے، مزاح کے موڈ میں بھی رکھ رکھاؤ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے ان کے مزاح میں بھی ایک تمکنت ہوتی تھی۔ اگر کسی کے بارے میں یہ تذکرہ سامنے آئے کہ فلاں بہت بڑا عالم ہے تو محسن صاحب فوراً سوال کرتے تھے وہ کتنی زبانیں جانتا ہے؟ وہ کسی کی علمیت کا فیصلہ زبان دانی کے حوالے سے کرتے تھے، وہ محمد حمیداللہ کو اسی بنیاد پر بہت بڑا عالم سمجھتے تھے کہ وہ تقریباً سات زبانیں جانتے تھے۔ صدیقی صاحب تاریخی شعور پر بہت زور دیتے تھے وہ عموماً اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر آپ نے ماضی کو حال کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی تو درست نتائج تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ مجھ سے کئی بار انہوں نے کہا کہ تاریخ کا معروضی مطالعہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب آپ میں تاریخی شعور ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ہر دور، ہر معاشرہ اور ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے تاریخ کا طالب علم جب کسی عہد کے واقعات و حوادث کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اس عہد کے احوال وظروف، اس قوم کے عوائد رسمیہ اور اس سوسائٹی کی اساس و روح سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جس عہد کا وہ مطالعہ کرتا ہے،

> اس کی عقلیت، اس کے اخلاق اور اس کے رسوم کو مدنظر رکھنا اور انہی معیاروں پر اشخاص وحوادث کو پرکھنا پڑتا ہے۔ ماضی کے افراد وحوادث کو حال کے معیار سے جانچنا۔۔۔ اور اس پر احوال ماضیہ کو مبنی برحق یا بر باطل قرار دینا تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہے''[illegible]

وہ مستشرقین کی تاریخ نگاری کو ''تنقیص'' اور مشرقی فضلاء کی تاریخ نویسی کو ''تقریظ'' سمجھتے ہیں اور دونوں کو رد کرتے ہیں۔[illegible]

صدیقی صاحب کی تاریخ نگاری اصولوں پر مبنی تھی، اسلامی تاریخ نویسی کے جن اصولوں کی پیروی کی اس کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب الصدیق کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مآخذ کے ضمن میں صدیقی صاحب اسلامی تاریخ کا سب سے اول، اور مستند مآخذ قرآن کو مانتے ہیں۔ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں ہے مگر عہد نبوی میں جو واقعات رونما ہوئے ان کا متعدد مقامات پر قرآن مجید میں ذکر موجود ہے۔ اسی طرح قرآن میں اقوام گزشتہ، انبیاء کرام اور اساطیر الاولین کے قصے، موعظت وعبرت پذیری کی غرض سے بار بار بیان ہوئے ہیں اور ضمناً بہت سے تاریخی واقعات بیان ہوگئے ہیں جسے علی محسن اہل اسلام کی تاریخ کے ہر دور کے لئے مستند ترین، موثق ترین اور معتبر ترین مآخذ قرار دیتے ہیں۔[illegible]

ان کے نزدیک اسلامی تاریخ کا دوسرا اہم ماخذ کتب احادیث نبویہ ہیں۔ اس حوالے سے وہ تاریخ نویسی کا یہ اصول بناتے ہیں کہ کسی ایک واقعہ سے متعلق اگر مجموعہ ہائے حدیث میں روایت، تاریخ کی کتاب کے خلاف ہے تو احادیث کی روایت کو بالعموم ترجیح ہوگی۔ وہ احادیث کو روایت تاریخیہ پر ترجیح دیتے ہیں اور ان سے تاریخی واقعات کی توثیق کا کام لیتے ہیں۔ یے اس حوالے سے ان کی تالیف الصدیق میں واقعہ قرطاس کا جہاں بیان ہے وہاں روایات کی درایت کرتے ہیں اور اس درایت کے نتیجے میں صحیحین کی روایت کو بھی درایت کی کڑی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔[illegible]

وہ ایک محتاط مورخ تھے، روایات کو انہوں نے قبول ضرور کیا لیکن ان کی جرح و تعدیل اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ان کی توثیق یا تضعیف سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔ کسی روایت کی محض اس بناء پر توثیق نہیں کی گئی ہے کہ اس کے رواۃ ثقہ ہیں، بلکہ اسے اس عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے درایت کے کسوٹی پر پرکھا بھی گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''روایات کی اساس پر کارناموں کی عمارت تعمیر نہیں کی گئی ہے بلکہ واقعات تاریخیہ سے کارنامہ ہائے خلافت کو موثق، معتبر اور مستند قرار دیا گیا ہے۔ خصوصاً فضائل شخصی پر مبنی روایات کو بڑی احتیاط سے قبول کیا گیا اور اشخاص کی توصیف کے لئے اس عہد کے حوایج وظروف کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اس ضمن میں محدثانہ بحث کے بجائے مورخانہ تنقید اور تطبیق کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور تاریخ کو جو شعور وقت سے عبارت ہے، اس کے اسی درجہ میں رکھا گیا ہے''[illegible]

بعض مقامات پر خصوصاً الصدیق کی تالیف کے دوران، انہوں نے اہل تشیع کی نہایت مستند کتاب ''الکافی'' سے بھی استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب ابوجعفر محمد بن یعقوب الرازی الکلینی (م ۳۲۸ھ) کی تالیف وتدوین ہے اور اسے فقہ جعفریہ میں وہی درجۂ ثقاہت حاصل ہے جو فقہ اہل سنت میں امام محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) کی ''الجامع الصحیح'' کو حاصل ہے۔

قرآن وحدیث کے بعد اسلامی تاریخ کا تیسرا اہم مآخذ کتب سیرت ومغازی اور کتب طبقات ہیں اور پھر متقدمین مورخین کی کتب تاریخ ہیں۔ اسلامی تاریخ میں متعلقہ دور کی کتب ادب کو ایک مستند اور مفید مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ صدیقی صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں بالعموم تاریخ نویسی کے دوران عربی ادب کی کتابوں کو نظر انداز کردیا جاتا ہے حالانکہ ان کتابوں میں اشخاص ومجتمع کے متعلق معلومات موجود ہیں۔ آخری مآخذ کے طور پر صدیقی صاحب جدید مورخین کی کتب کو اہم گردانتے ہیں۔

وہ مستشرقین کو مسترد کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے "..... مستشرقین نے ایک خاص نقطۂ نظر سے یہ کتابیں لکھی ہیں اور غیر جانب داری کے پردے میں انہوں نے حد درجہ تعصب سے کام لیا ہے مؤلف نے فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانوں میں لکھی جانے والی کتب، ان کے انگریزی یا عربی تراجم کی مدد سے مطالعہ کی ہیں اور برموقع ان کی دسیسہ کاریوں سے قاری کو آگاہ بھی کیا ہے۔ ان کتابوں سے کسی طرح کا استفادہ کرنا بے سود ہے کہ یہ مستند وموثق ہیں بھی نہیں۔۱۰

محسن صاحب مستشرقین کو کبھی تو درخور اعتناء ہی نہیں سمجھتے اور اگر کبھی ان سے اخذ و اکتساب کرتے بھی ہیں تو محض ضمنی معاملات میں۔ مستشرقین کے بارے میں ان کی سخت رائے یہ ہے:

> مغربی تاریخ نگاروں کا یہ وتیرہ ہے کہ وہ کسی فرد یا واقعہ سے متعلق ایک مفروضہ قائم کر لیتے ہیں اور واقعات و دستاویزات کو توڑ مروڑ کر اس مفروضہ کی حقیقت پر دلائل قائم کرتے ہیں، وہ کبھی نتیجہ کو سبب اور کبھی سبب کو نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح واقعات مابعد کو حادثات ماضیہ کی علت کہہ کر اپنا بیانیہ مرتب کرتے ہیں اور کبھی مجہول روایتوں کو عمداً درست و صحیح ثابت کرکے اپنے دل پسند نتائج استخراج کرتے ہیں یہ طریقے جنہیں وہ Research Method کہتے ہیں، دراصل سوفسطائی ہیں اور ان پر اپنے بیان کی بلندوبالا عمارات کی تعمیر "بناء الفاسد علی الفاسد" کے مصداق ہے"۔۱۱

اسی تسلسل میں وہ کہتے ہیں:

> "یہ شرق شناسوں کی دسیسہ کاری عام قاری کو فریب دینے کی ایک سعی نامشکور ہوتی ہے اور اس سے علم نافع کے بجائے جہل قاطع کو فروغ حاصل ہوتا ہے بالعموم مستشرقین اس اسلوب کو ہماری تاریخ و ثقافت کے بیان میں اختیار کرتے ہیں اور اپنی مزعومہ غیر جانب داری کے پردے

> میں تعصب وعداوت کو ہوا دیتے اور اسلام کی بیخ کنی کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کا یہ مذہبی عناد، علمی فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اغیار ہی نہیں ہمارے ناواقف افراد بھی اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ یہ جعل و دجل مذہبی اختلاف رکھنے والے "اہل مشرق" کے ہاں بہت مقبول ہے یہ لوگ وضعی وجعلی روایتوں اور الحاقی کتابوں کے حوالوں سے اپنے بیانات کو مزید موثق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں تاریخ جعل و دجل کا پشتارہ بن کر رہ جاتی ہے اور قاری کے لئے حق کو باطل سے اور ثمین کو غث سے تمیز کرنا ممکن نہیں رہتا۔ تاریخ مناظرانہ جدلیات کا ایک حصہ بن جاتی ہے"۔۱۲

محسن صاحب مستشرقین کی کتابوں کے بارے میں لکھتے ہیں "وہ بنیادی مآخذ نہیں ہیں اور ان کی ثقاہت محل نظر ہے"۔۱۳ ایک جرمن مستشرق جے ولہاوزن جس کی کتاب کا محسن صاحب نے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے اسے ایک جگہ "فاضل شرق شناس" کہتے ہیں۱۴ لیکن ساتھ ہی لکھتے ہیں:

> "فاضل مستشرق کا اسلوب نگارش یہ ہے کہ کسی واقعہ سے متعلق مختلف روایتوں کی چھان پھٹک کرکے وہ بیانیہ کی توثیق کرتا ہے مگر وہ مورخانہ دقت نظر سے کام نہیں لیتا اور نہ روایات و رواۃ کی جرح و تعدیل میں الجھتا ہے غالباً اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے خواجہ تاش شرق شناسوں کی طرح پہلے سے ایک موقف متعین کر لیتا ہے اور اس کی توثیق و تحقیق کی خاطر رواۃ و روایات سے بحث کرتا ہے۔ یہ رجحان بڑا خطرناک ہے"۔۱۵

واقعات کے بیان میں جو زبان وہ اپناتے ہیں وہ مورخانہ ہے، کیونکہ تاریخ کی

اپنی زبان ہوتی ہے اور مناظرہ کی اپنی، ہمارے یہاں بالعموم تاریخ میں مناظرانہ روش اختیار کی جاتی ہے اور اثبات حقائق میں جدلیاتی اسلوب سے کام لیا جاتا ہے۔ علی محسن کی زبان سنجیدہ، علمی اور باوقار ہے، عربی تراکیب کے استعمال نے اردو داں طبقہ کے لئے کہیں کہیں، اسلوب کو بوجھل بنادیا ہے لیکن ایسا ہر جگہ نہیں ہے۔

علی محسن صدیقی کی تصانیف میں طبع زاد اور تراجم دونوں شامل ہیں۔ تراجم میں آپ کا مخصوص میدان عقائد ہے، آپ نے عقائد کی جن اہم کتابوں کا مکمل اردو ترجمہ کیا ان میں رازی کی کتاب عقائد مسلمین ومشرکین، شہرستانی کی الملل والنحل، عبدالقاہر بغدادی کی الفرق بین الفرق، علاء الملک جوینی کی تاریخ جہاں کشائی (تاریخ اسماعیلیہ)، جے ولہاوزن کی عہد اموی کے سیاسی و مذہبی احزاب (شیعہ وخوارج) وغیرہ شامل ہیں۔ یوں علی محسن کی کتاب المعارف کو چھوڑ کر ترجمہ کی ہر کتاب کا تعلق کتب ہائے عقائد سے بنتا ہے۔ عقائد کی تشکیل کے تاریخی پہلو ان کا خاص میدان تخصص ہے۔ ان انتہائی اہم ترین کتابوں کے تراجم نے تحقیق کے بہت سے افق واضح کردیے ہیں، ذیل میں ان کتابوں کا مختصراً جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

کتاب المعارف:

ابومحمد عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ الدینوری (م۸۸۹ء) کی مشہور زمانہ تالیف ''کتاب المعارف'' کا پہلا مستند اردو ترجمہ علی محسن صدیقی صاحب نے کیا، یہ کتاب ادارۂ قرطاس کی طرف سے ۱۹۹۹ء میں پہلی بار طبع ہوئی، اس کا دوسرا ایڈیشن رواں سال متوقع ہے۔ علمی حلقوں میں یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ المعارف کو تاریخ کی کتاب سمجھا جائے یا ادب کی۔ خود ابن قتیبہ عربی ادب کے اساطین میں شمار ہوتے تھے، ابن خلدون (م۱۴۰۶ء) نے ابن قتیبہ کو عربی زبان کے چار عظیم انشاء پردازوں میں شمار کیا ہے، دیگر تین انشاء پردازوں میں جاحظ، مبرد اور قالی ہیں۔ خود مصنف کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ مورخ ہیں نہ ہی مترجم کو اس پر اصرار ہے۔ غالباً حاجی خلیفہ (م۱۶۵۷ء) نے سب سے پہلے اس کتاب کو ''المعارف فی التاریخ'' لکھا اور پھر یہ توضیح دوسرے تذکرہ نگاروں نے اپنائی۔ ڈاکٹر انیس احمد کہتے ہیں ''المعارف، انساب اور تذکرہ

کی نوعیت کی کاوش ہے اور اسی حوالے سے اس کی پہچان ہونی چاہئے''۔ [۱۵]

شائد یہ کہنا بجا ہوگا کہ المعارف اپنے زمانے کی علمی و ثقافتی روایت کے پیش نظر تالیف کی گئی۔ وہ علمی سرگرمی یا علمی تحریک جو عہد رسالت سے شروع ہوئی، عباسی عہد میں اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی، عباسی عہد ذہنی وفکری سرگرمیوں کے لئے دوسرے ادوار سے نمایاں اور ممتاز ہے، ابن قتیبہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے بغداد سے تعلق رکھتے ہیں، یہ دور علوم اسلامیہ کا تدوینی دور تھا۔ حدیث، تفسیر، تاریخ اور ادب کی امہات الکتب مدون ہو رہی تھیں۔ علمی مجالس میں ادبی، علمی اور تاریخی بحثیں عروج پر تھیں۔ لوگ معلومات سے لیس رہنا چاہتے تھے تاکہ علمی مجالس میں خفت وشرمندگی سے محفوظ رہا جاسکے، لہٰذا ڈاکٹر نثار احمد کا یہ کہنا درست ہے کہ ''اس اعتبار سے یہ 'مختلف معلومات' کا خزینہ ہے جسے ''مجلسی ضرورت'' کے تحت قلمبند کیا گیا ہے''۔ [۱۶] زیر نظر عہد میں اس طرز کی اور بھی کتابیں لکھی گئی تھیں جن میں اہم ''کتاب المحبر'' ہے، جس کے مؤلف محمد بن حبیب بغدادی (م۲۴۵ھ) ہیں۔ [۱۷]

کتاب المعارف کا پہلا نامکمل ترجمہ ''تاریخ الانساب'' کے نام سے سلام اللہ صدیقی صاحب نے کیا تھا، جو پاک اکیڈمی کراچی سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ترجمہ اچھا لیکن نامکمل تھا یعنی تقریباً نصف کتاب کا۔ مکمل کتاب کے ترجمے کا سہرا علی محسن صدیقی صاحب ہی کے سر بندھتا ہے ترجمہ کے ساتھ ہی علی محسن صاحب نے انتقاد کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ علی محسن صاحب نے اپنے طے کردہ منہج ترجمہ کے مطابق عربی متن کے قریب رہنے کی کوشش کی ہے۔ علوم کی کتاب کا ترجمہ آسان جبکہ ادب وفلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ دشوارتر ہوتا ہے۔ عربی ادب میں ایجاز کو بڑی صفت مانا گیا ہے، معارف میں بھی بعض مقامات پر بہت زیادہ ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے، لہٰذا اس کا ترجمہ آسان نہیں تھا۔ بعض مقامات پر مترجم کو اصل عبارت پر اضافہ کرنا پڑا ہے۔ تاہم اپنے اضافوں کو بین القوسین رکھا گیا ہے۔ اور یوں مصنف اور مترجم کی عبارتوں کا فرق قائم رکھا گیا ہے۔

تاریخ اسماعیلیہ:

طباعت کے اعتبار سے علی محسن صاحب کی ترجمہ کردہ دوسری کتاب جو ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آئی، تاریخ اسماعیلیہ ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ عطا ملک جوینی (م ۱۲۸۳ء) کی مشہور فارسی تصنیف 'تاریخ جہاں کشائی' منگولوں، خوارزم شاہوں، اور اسماعیلیوں کے حالات کے مستند و تاریخی مآخذ کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ یہ کتاب اپنے وقت تصنیف سے آج تک مورخین اور محققین میں متداول رہی، کتاب کا تیسرا اور آخری حصہ اسماعیلیوں کے حالات سے خاص ہے، جوینی کا تعلق بھی اسماعیلیوں کے عہد آخر سے ہے، اسی لئے جوینی ان تمام تاریخی حالات و واقعات کا عینی شاہد تھا۔ اس کتاب کا ایک اعلیٰ نسخہ ۱۹۳۷ء میں ہالینڈ سے طبع ہوا تھا، اسی ایڈیشن کے حصہ سوم کا ترجمہ 'تاریخ اسماعیلیہ' کے نام سے علی محسن صدیقی نے پیش کر کے بجاطور پر ایک بڑی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔۱۱

جہاں کشائی کے اسلوب نگارش کے بارے میں یہ مسلم ہے کہ وہ تیرھویں صدی عیسوی کی اس نثر نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے جو صنائع و بدائع اور عبارت آرائی سے ممتاز ہے۔ عطاء ملک ایران کے قدیم اور ممتاز خاندان سے تعلق اور دربار میں اعلیٰ مناصب اور صاحب دیوان کی نسبتوں سے سرفراز اور علم وفضل میں یگانہ تھا۔ اس کی یہ تاریخ اس کے علم وفضل اور نثر و انشاء کی بہترین مثال ہے، اس مرصع تحریر کا ترجمہ آسان کام نہیں یہ ترجمہ سے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ان کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے محسن صاحب کی اہم علمی خدمت یہ سامنے آتی ہے کہ انھوں نے جہاں کشائی کے متن پر حواشی کا اہتمام کیا ہے، یہ گراں قدر حواشی صرف متن کتاب ہی کو نہیں بلکہ اس دور کی تاریخ کو سمجھنے میں بھی معاون ہیں۔

الملل والنحل:

ترتیب طباعت کے اعتبار سے علی محسن صدیقی کا تیسرا ترجمہ جو ادارۂ قرطاس کے توسط سے منظر عام پر آیا، وہ امام شہرستانی (م ۵۴۸ھ) کی مشہور و معروف کتاب الملل والنحل

کا ترجمہ تھا، اس کتاب کا بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا تھا تاہم اردو کے قالب میں پہلے پہل علی محسن صدیقی ہی نے ڈھالا اور قرطاس کے توسط سے یہ کتاب ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی، اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۰۰۰ کی تعداد میں ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔ تاہم اس کے بارے میں شاہ مصباح الدین شکیل صاحب نے یہ لکھا تھا کہ غالباً اس کتاب کا ایک ترجمہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔۱۲

کتاب کے آغاز میں علی محسن کا عالمانہ مقدمہ ہے، صدیقی صاحب نے مقدمہ نگاری میں عرب خصوصاً مصری مورخین کے طرز کی پیروی کی ہے جس میں مقدمہ کتاب تین واضح حصوں میں تقسیم ہوتا ہے، (الف) عصر المولف، (ب) حیاۃ مولف، (ج) تالیف۔ علی محسن نے بیشتر مقدمات اسی نہج پر لکھے ہیں، یوں یہ مقدمات قارئین کے لئے استفادۂ مزید کا سبب بن جاتے ہیں۔ عقائد کی کتابوں کا ترجمہ آسان نہیں ہوتا اس حوالے سے محسن صاحب کا میدان تخصص دشوار تر تھا، تراجم میں ان کا اسلوب علمی، زبان شائستہ اور ترجمہ متوازن ہے۔

عہد اموی میں سیاسی و مذہبی احزاب:

چوتھا ترجمہ جو سامنے آیا وہ جرمن مستشرق جولیس ولہاوزن۱۳ کی جرمنی زبان میں لکھی گئی کتاب Die Religus-Poltischen Opposition Im Alten Islam کا اردو ترجمہ ہے، اس کتاب کے عربی اور انگریزی تراجم ہو چکے تھے، اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آر، ایم لیبی ڈس نے کیا جبکہ اس کا عربی ترجمہ مصر کے مشہور فاضل عبدالرحمن بدوی نے کیا اور وہ قاہرہ سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ ولہاوزن کی اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ خوارج سے جب کہ دوسرا حصہ شیعہ سے متعلق ہے۔ پہلے محسن صاحب نے کتاب کے دوسرے حصے کا ترجمہ عہد اموی میں سیاسی و مذہبی احزاب کے عنوان سے کیا جو قرطاس کی طرف سے جون ۲۰۰۴ء میں پہلی بار اور جنوری ۲۰۰۷ء میں دوسری بار طبع ہوا، جبکہ اس کتاب کے پہلے حصے کا ترجمہ 'الخوارج' کے نام سے صدیقی صاحب نے بعد میں کیا جو ادارہ قرطاس کے زیر اہتمام پہلی بار ۲۰۰۹ء میں طبع ہوا۔

ولہاوزن کی کتاب کا ترجمہ چنداں آسان نہیں تھا، ولہاوزن نے اپنے اس مقالے کی بنیاد طبری پر رکھی ہے، جبکہ طبری نے طریق جمع الروایات پر عمل کرتے ہوئے ہر قسم کی روایات جمع کردی ہیں۔ طبری کی جمع کردہ روایات میں تحقیق، ترتیب اور تمحیص بڑا مشکل کام ہے، ولہاوزن نے اس کار دشوار کو سر کیا ہے، مترجم نے ولہاوزن کے متعلقہ بیانات کی تاریخ طبری سے مراجعت کی اور اگر کہیں مترجم نے یہ سمجھا کہ ولہاوزن سے طبری کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے تو اس کی تصحیح مترجم نے کردی ہے اور ایسا کئی مقامات پر ہوا ہے۔

اس کتاب میں باب اول ''قتل حجر بن عدی'' کا ترجمہ علی محسن صاحب نے ۱۹۶۸ء میں کیا تھا اور وہ رسالہ برہان دہلی کے شمارہ جنوری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں محسن صاحب نے ولہاوزن کی تصحیح وتعدیل کے علاوہ طویل اختلافی حواشی لکھے ہیں۔ بقیہ ابواب کا ترجمہ ربع صدی کے بعد ہوا لہٰذا محسن صاحب نے جو منہج ترجمہ باقی کتاب کے لئے اختیار کیا اور اس کا تذکرہ انھوں نے اپنے مقدمہ (ص۹) میں کیا ہے، حجر بن عدی کا وہ منہج نہیں ہے۔ محسن صاحب نے متن کتاب میں حواشی کا اضافہ کیا ہے، بلکہ انگریزی کے بعض ضروری حواشی کا ترجمہ کرکے شامل کتاب کیا گیا ہے۔

ولہاوزن نے طبری کے لائیڈن ایڈیشن کے حوالے دیئے ہیں۔ یہ ایڈیشن اب نایاب ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں دارالمعارف مصر سے طبری کا ایک نہایت محقق ایڈیشن شائع ہوا ہے، محسن صاحب نے حوالوں میں لائیڈن ایڈیشن کے متوازی مصری ایڈیشن کا ایزاد کردیا ہے، یوں اہل علم حضرات کے لئے دونوں ہی ایڈیشنوں سے مراجعت آسان ہوگئی ہے۔ ولہاوزن کی اسی کتاب کے پہلے حصے کا ترجمہ 'الخوارج' کے نام سے ۲۰۰۵ء سے منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب بھی حسب سابق ادارۂ قرطاس نے شائع کی۔

عقائد مسلمین ومشرکین:

مندرجہ بالا وقیع وضخیم کتابوں کے تراجم کے علاوہ علی محسن نے امام فخرالدین رازی کی عقائد و مسلمین ومشرکین کا ترجمہ بھی کیا یہ ترجمہ پہلی بار ۲۰۰۷ء میں علمی کتاب گھر، کراچی نے شائع کیا۔ یہ امام رازی کا مختصر رسالہ تھا۔ متن ترجمہ میں حواشی کا ایزاد محسن صاحب کا بہت بڑا کام ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسالہ کی ضخامت ۳۳ صفحات ہے کہ جبکہ سات صفحات کا مقدمۂ مترجم اور ۶۶ صفحات کے حواشی ہیں۔ گویا مترجم نے مصنف سے دوگنا مواد قاری کے لئے فراہم کیا ہے۔ ان سینکڑوں حواشی کی قدروقیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ان کی وجہ سے تفہیم متن آسان ہوجاتی ہے۔

الفرق بین الفرق:

عقائد کے حوالے سے آخری کتاب جس کا علی محسن صدیقی نے اردو میں ترجمہ کیا وہ عبدالقاہر بغدادی (م ۴۲۹ھ) کی مشہور زمانہ کتاب الفرق بین الفرق تھی، جسے قرطاس کی طرف سے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا گیا، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۹ء میں اور تیسرا ایڈیشن رواں سال کے اواخر تک متوقع ہے۔ یہ کتاب تاریخ و عقائد مذاہب کے موضوع پر ایک نہایت مستند کلاسیکی دستاویز ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے مختلف فرقوں کے عقائد و افکار کا صرف ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان پر نقدوجرح بھی کی ہے۔ مترجم نے بھی حسب سابق مقدمہ وحواشی کا اہتمام کرکے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے، گو کہ ان کے بعض نکات سے بعض اہل علم نے اتفاق نہیں کیا مثلاً عبدالرشید رحمت صاحب کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اختلافی نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''الفرق بین الفرق'' کے موضوع پر جناب مترجم کا وسیع مطالعہ ہے، جس کا بھرپور اظہار حواشی میں ہوا ہے، تاہم ان کی بعض آراء سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، مثال کے طور پر انہوں نے ''مقدمہ'' (صفحات ۳۵-۲۱) میں لکھا ہے: ''گروہ متکلمین عرب جس نے۔۔۔ اسلام میں عقل کے کردار پر پرزور مقالے تحریر کیے اور دین کو عربوں کے توہمات اور عجمیوں کی خرافات سے پاک کیا، ان معتزلی علماء پر مشتمل تھا جس کے سید الطائفہ واصل بن عطاء، الغزالی اور عمرو بن عبید تھے''۔ (ص ۲۵)

کیا امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کو معتزلی قرار دینا درست ہے؟ مولانا شبلی نعمانی نے انہیں اشاعرہ سے ہٹ کر متکلم وصوفی لکھا ہے، مگر معتزلی نہیں لکھا۔

اسی طرح جناب مترجم نے عبدالقاہر بغدادی کے بارے میں لکھا ہے: "ہمارے مصنف تمام عمر تصنیف وتدریس میں مشغول رہے اور طلبہ کی کھلے ہاتھوں سے مالی دست گیری کرتے رہے، وہ علم فروع، یعنی فقہ و فرائض میں اور علم اصول، یعنی علم کلام میں مہارت تامہ رکھتے تھے، انہیں "الاصولی" بھی کہا جاتا ہے" (ص ۳۰)۔ "علم اصول" کو "علم کلام" قرار دینا درست نہیں۔ اصولی، فن اصول فقہ کے ماہر کو کہا جاتا ہے نہ کہ علم کلام کے ماہر کو۔ ۳۲

یوں علی محسن صدیقی کی طبع زاد کتب ہوں یا تراجم، علمی حلقوں میں نہ صرف ان کی پذیرائی ہوئی بلکہ سوالات اٹھائے گئے، جوابات کی تلاش نے علمی سرگرمی میں اضافہ کیا۔ علی محسن صاحب نے عربی ادب کے مشہور قصیدہ بردہ اور قصیدہ بانت سعاد کے ترجمہ و شروح بھی لکھیں جو عربی ادب کے طلباء وطالبات کے لیے معاون ثابت ہوئیں۔

محسن صاحب کی طبع زاد تصانیف میں 'الصدیق' (۲۰۰۳ء)، 'تاریخ سلاطین تغلق' (۲۰۰۵ء)، 'عہد فاروقی کے باکمال' شامل ہیں، ان کے مقالات کے دو مجموعے 'مقالات تاریخی' (۲۰۰۳ء) اور 'مضامین تاریخی' (۲۰۰۷ء) شائع ہو چکے ہیں جن میں ان کے ۳۳ مقالات اکٹھے کیے گئے ہیں۔ ان کی مقدمہ نگاری بھی اہم ہے، اس معاملہ میں وہ مصری مورخین ومرتبین کے طرز کی پیروی کرتے تھے، ان کے سات مقدمات کا مجموعہ 'مقدمات تاریخی' (۲۰۰۹ء) بھی ادارہ قرطاس شائع کر چکا ہے۔

نومبر ۲۰۱۰ء میں جب علی محسن صاحب کی رفیقۂ حیات سیدہ صدیق فاطمہ بیگم کا

انتقال ہوگیا، جن سے علی محسن صاحب کی رفاقت کا سلسلہ پچپن سال سے زائد عرصہ پر محیط تھا اور جن کی رفاقت علی محسن صاحب کو اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کا حوصلہ دیتی تھی، ان کے انتقال کے بعد علی محسن چودہ ماہ حیات رہے اور زیادہ تر علیل رہے۔ ان کا لکھنا پڑھنا بہت کم ہوگیا تھا۔ وہ ۲۰۱۱ء سے تین کتابوں پر کام کر رہے تھے۔ ایک سیرۃ الرسول اللہ، دوسرے سوانح حضرت عمر فاروق اور تیسرے سوانح حضرت علی، انہوں نے تینوں کتابوں کا غالب حصہ تحریر کرلیا تھا لیکن تکمیل کی مہلت اجل نے نہ دی۔

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے ناصر کاظمی

علی محسن صدیقی صاحب کی ابتدائی چند کتابوں کے علاوہ ان کی بیشتر کتب ادارہ قرطاس سے طبع ہو کر علمی حلقوں تک پہنچیں۔ میرے ذہن میں ایک اشاعتی ادارہ کے قیام کا منصوبہ تو عرصہ سے تھا لیکن اس کو عملی شکل دینے میں ۱۹۹۸ء میں علی محسن صدیقی کے گھر پر ہونے والی ایک ملاقات نے مہمیز کا کام کیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے اس ملاقات میں مجاہد صاحب (مرحوم) بھی موجود تھے، گفتگو مختلف موضوعات پر ہو رہی تھی، جس کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ محسن صاحب کی کئی کتابیں تیار ہیں لیکن وہ کسی بھی پبلشر سے خوش نہیں، اور کسی کو بھی یہ کتابیں دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس وقت میں نے سر سے کہا کہ میرا ایک اشاعتی ادارہ ہے آپ اپنی کتاب مجھے دیں۔ مجھے یہ جھوٹ اس لئے نہیں لگا کہ اشاعتی ادارہ میرے دماغ میں محفوظ و موجود تھا، جسے کسی بھی کتاب کی طباعت سے عملی شکل دی جاسکتی تھی۔ بڑے کاموں کے لئے ہوم ورک کی ضرورت ہوتی ہے، ٹیم بنتی ہے، مشاورتیں ہوتی ہیں، جگہ کا انتخاب، سرمائے کی فراہمی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرطاس ایک "جملے" سے قائم ہوگیا۔ سر نے اپنی عادت کے مطابق جب میرے اشاعتی ادارے (جس کا نام قرطاس یا قرطیس میں نے سوچ رکھا تھا) کے بارے میں مجھ سے تحقیقات کیں تو انہیں اس کے 'کاغذی' ہونے کا اندازہ ہوگیا، اس کے باوجود مجھے

نہیں معلوم مجھ پر کیوں اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے ''کتاب المعارف'' کا مسودہ مجھے تھمادیا۔ میں نے گھر آکر اپنے شوہر سجاد ظہیر (مرحوم) کو بتایا، ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ کتاب کی اشاعت کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے گا، ایک معصوم سی تیز بلی میرے دماغ میں موجود تھی، میں نے کہا اپنے پراوڈنٹ فنڈ کے مقابل قرضہ لوں گی۔ ایک لاکھ کا قرضہ لیا گیا۔ کتاب المعارف شائع ہوگئی، اور کسی بھی مارکیٹ اسٹریجی کے بغیر اسی سال فروخت ہوکر ختم ہوگئی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں لوگ جو کچھ پڑھنا چاہتے ہیں وہ ان کو نہیں ملتا اور اگر ملے تو ہر حال میں حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد تواتر سے قرطاس نے علی محسن صاحب کی آٹھ کتابیں شائع کیں۔ آج قرطاس کے قیام کو تیرہ سال گزر چکے ہیں اور وہ تاریخ، ادب اور علوم اسلامیہ کے موضوعات پر نوے کتابیں شائع کرکے اشاعتی اداروں میں اپنا ایک مقام بنا چکا ہے۔ آج کل اس ادارہ کے نگراں سعود ظہیر ہیں اور اس کا دفتر یونی ورسٹی روڈ پر ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

محسن صاحب میں شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق تھا، وہ شاعر بھی تھے، عربی اور فارسی میں کم جبکہ اردو میں بیشتر شعر کہتے تھے، ان کا ایک شعری مجموعہ تیار تھا جو تا حال زیور طباعت سے آراستہ نہ ہوسکا۔

محسن صاحب مجھے افسانہ نگاری و شاعری سے دور رکھنا چاہتے تھے، ان کا کہنا تھا علمی تحقیقات کی طرف توجہ دو، اسلامی تاریخ کے حوالے سے کرنے کے بہت کام ابھی باقی ہیں۔ تمہاری شناخت ایک محقق کے طور پر ہونی چاہئے، افسانہ نگار اور شاعرہ کے طور پر نہیں اور پھر میں ایک سعادتمند شاگرد کی طرح ان کی نصیحت گرہ میں باندھ لی۔ موزونئ طبع کے بموجب کبھی کوئی افسانہ لکھ لیا جائے تو الگ بات ورنہ شعر و افسانہ کی طرف خصوصی توجہ ختم کردی اور تحقیق کی راہ پر وخار پر ننگے پاؤں سفر کا آغاز کردیا۔ محسن صاحب پر ابھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے

لیکن ان پر اپنے اس پہلے (آخری نہیں) مضمون کا خاتمہ ان کی ایک خوبصورت غزل پر کرتی ہوں، جو انہوں نے مجھے اپنے قلم سے ۲۰۰۱ء میں لکھ کر بھیجی تھی، مجھے معلوم نہیں یہ کہیں سے طبع ہوئی یا تا حال غیر مطبوعہ ہے۔

وہی چمن ہے، وہی گل ہیں، آب جو بھی وہی
وہی ہے ساقی مہ وش، مے و سبو بھی وہی
وہی ہے بزم حریفان بادہ پیما بھی
ہے میکدہ بھی وہی، شور ہاؤ ہو بھی وہی
مگر نہ بزم میں، میں ہوں، نہ تو ہی اے ہمدم
کہ میں تخیل حوادث ہوں اور تو بھی وہی
ہم ایسے تشنہ لبوں کو تو ذرہ بھی نہ ملی
نصیب بوالہوساں، بادہ و سبو بھی وہی
بہت ہی خوار ہیں، آداب مے کشی کے اسیر
ہر ایک جرعہ پہ بھٹکے جو، سرخ رو بھی وہی

حواشی و حوالہ جات

۱۔ علی محسن صدیقی صاحب کا انتقال ۱۴ جنوری ۲۰۱۰ء کو ہوا، تدفین ۱۵ جنوری کو سخی حسن قبرستان میں ہوئی۔

۲۔ قلمی شذرہ از علی محسن صدیقی، مخزونہ نثار سجاد ظہیر۔

۳۔ صدیقی صاحب لکھتے ہیں "ڈاکٹر نثار سجاد ظہیر اور میرے ایک اور شاگرد محمد شکیل صدیقی (اسسٹنٹ پروفیسر اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی) کا یونیورسٹی میں بحیثیت استاد تقرر ایک خوش آئند عمل ہے اور بجا طور سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان دونوں کی علمی لیاقت و ذہنی صلاحیت کی بدولت شعبہ ترقی کرے گا اور اپنی علمی شان کو نہ صرف برقرار رکھے گا، بلکہ اسے مزید تابناک بنائے گا۔ آمین" (الصدیق، ص ۳۳)

۴۔ علی محسن صدیقی، عہد اموی میں سیاسی و مذہبی احزاب، مقدمہ، ص ۸، ۹، قرطاس، کراچی، ۲۰۰۹ء

۵۔ ایضاً، ص ۹

۶۔ الصدیق، مقدمہ، ص ۱۸

۷۔ الصدیق، مقدمہ، ص ۴۰

۸۔ الصدیق، مقدمہ، ص ۵۰، ۵۸

۹۔ الصدیق، مقدمہ، ص ۱۵

۱۰۔ الصدیق، مقدمہ، ص ۳۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۱۸

۱۴۔ علی محسن صدیقی، مقدمہ، مشمولہ، عہد اموی کے سیاسی و مذہبی احزاب، ص ۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۸

۱۶۔ ڈاکٹر انیس احمد، تبصرہ بر المعارف، مشمولہ نقطۂ نظر، مسلسل شمارہ ۱۲، اپریل - ستمبر ۲۰۰۲ء، پالیسی اسٹڈیز سینٹر، اسلام آباد

۱۷۔ مکتوب ڈاکٹر نثار احمد، بنام نثار سجاد ظہیر، مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۹۹ء، مخزونہ نثار سجاد ظہیر

۱۸۔ کتاب المحبر، تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے ایک معروف عرب ماہر لسان اور مورخ ابو جعفر محمد ابن حبیب بن امیہ بن عمرو (م ۲۴۵ھ/۸۶۰ء) کی تالیف ہے۔ ابن حبیب کی تقریباً بیالیس تصنیفات میں سے یہ سب سے زیادہ مشہور و معروف کتاب ہے۔ جس کا واحد مخطوطہ برٹش میوزیم (لندن) میں محفوظ ہے اور جسے ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بڑی محنت سے ایڈٹ کیا اور یہ کتابی شکل میں پہلی بار دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن سے ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب عرب جاہلیہ اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی سماجی و ثقافتی تاریخ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر نثار سجاد ظہیر کی نظر ثانی کے بعد پہلی بار ادارۂ قرطاس سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔

۱۹۔ "تاریخ جہاں کشائی" کے مصنف علاء الدین عطا ملک الجوینی اور ان کے بھائی شمس الدین کو منگول دربار میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ الجوینی ان چند مسلمان مدبروں میں سے تھے جنھوں نے خلافت بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے والے منگولوں کی صفوں کے اندر رہ کر اپنے اثر و رسوخ کو حتی الامکان مسلمانوں اور اسلام کے تحفظ کے لیے استعمال کیا۔ وہ دور مسلمانوں کے لیے سخت ابتلا اور آزمائش کا دور تھا، تاہم منگول رفتہ رفتہ اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوئے، اور بالآخر ان کا رہنما محمود ۱۲۹۵ء اور ۱۲۹۶ء کے درمیان حلقۂ اسلام میں داخل ہوا، اور احمد کے نام سے معروف ہوا۔ ۱۲۵۶ء میں جب ہلاکو خان قزوین کے شمال مشرق میں واقع البرز کے سلسلۂ کوہ کے دشوار گزار علاقے میں اسماعیلی مرکز الموت پر حملہ آور ہوا تو عطا ملک الجوینی اس کے ہمراہ تھا، اور جب اسماعیلی حاکم، ملک الجبال رکن الدین خورشاہ نے ہلاکو خان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو ایک فریق کی شکست اور دوسرے کی فتح کی دستاویز "فتح نامہ" الجوینی نے ہی تحریر کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جوینی کی مداخلت سے ہلاکو خان اسماعیلیوں کے کتب خانے کو آگ لگانے سے باز رہا تھا، اور اسی کتب خانے سے حاصل کردہ لوازمے سے جوینی نے اسماعیلیوں سے متعلق اپنی تاریخ کا حصہ مرتب کیا تھا۔

۲۰۔ مطبوعات جدیدہ، مشمولہ معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۲۰۰۹ء، ص ۲۳۷

۲۱۔ مکتوب، شاہ مصباح الدین شکیل، بنام نثار سجاد ظہیر، مورخہ ۲۵ جولائی ۲۰۰۹ء، خط میں شاہ صاحب لکھتے ہیں: قرطاس کی تازہ اشاعت "الملل والنحل" پر مبارکباد قبول کیجیے۔ فرائیڈے اسپیشل ۱۸ جولائی ۲۰۰۹ء میں پروفیسر محمد شکیل صدیقی کا تبصرہ بھی موصول ہے۔ پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ "اردو زبان میں کتاب الملل والنحل کا پہلی بار ترجمہ برصغیر پاک و ہند کے معروف اسکالر۔۔۔۔۔ پروفیسر علی محسن صدیقی نے کیا ہے"۔ یہ بیان شاید درست نہیں۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ لاہور سے تین جلدوں میں شہرستانی کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ کس نے کیا یاد نہیں"۔

۴۲ مستشرق ہے ولہاوزن جرمنی کے شہر ہیملن (Hem len) میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا۔ اس نے بطور خاص سامی زبانوں کی تحصیل پر توجہ دی، عربی اور عبرانی میں مہارت حاصل کی۔ اس کی ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزری۔ ولہاوزن نے واقدی کی کتاب المغازی کا جرمن ترجمہ کیا تھا (۱۸۸۲ء)، ابن الکلبی کی کتاب الاصنام مرتب کی تھی (۱۸۸۷ء)، اسلام کی قدیم ترین تاریخ (۱۸۹۹ء) برلن سے شائع ہوئی۔ ولہاوزن نے اس کتاب میں خلفاء راشدین کے عہد کی تاریخ کو اپنا موضوع بنایا ہے، یہ کتاب تاحال جرمن زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہوئی۔ 'عہد اموی میں سیاسی و مذہبی احزاب۔ الخوارج و الشیعہ' (۱۹۰۱ء) میں برلن سے شائع ہوئی۔ اسلامی تاریخ پر ولہاوزن کی ایک اہم ترین تصنیف 'دولت عربی اور اس کا سقوط' ہے یہ کتاب ۱۹۰۲ء میں برلن سے شائع ہوئی اس کا انگریزی میں ترجمہ مشہور فاضل Graham Weir نے کیا اور ۱۹۲۷ء میں کلکتہ سے طبع ہوا۔ ولہاوزن کی یہ تالیف عہد اموی کی پہلی مستند تاریخ ہے جو کسی مغربی زبان میں لکھی گئی۔ ولہاوزن نے مختلف موضوعات پر جو محققانہ مضامین اور مقالات لکھے وہ چھ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

۴۳ عبدالرشید رحمت، تبصرہ بر الفرق بین الفرق مشمولہ نقطۂ نظر (ص۵۱)، اکتوبر ۲۰۰۶ء تا مارچ ۲۰۰۷ء، پالیسی اسٹڈیز سینٹر اسلام آباد۔

۴۴ قلمی شذرہ، ''من کہ ۔۔۔۔'' تحریر منہ نگار سجاد ظہیر، مورخہ ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

An approach to study Dr. Fazl-ur-Rehman's works

Muzzammila Shafique

ABSTRACT

Dr. Fazl-ur-Rehman (1919-1989) was one of the prominent scholars of twentieth century who were very much concerned with the intellectual status of the Muslim world and a lack of proper understanding of the Quran. He believed that the Quran should be understood as a coherent system but he thought that unfortunately the underlying unity of Quranic text has never been realized fully in the history of Muslims. In addition to this, we see an insistence upon fixing on the words of various verses in isolation. He, therefore, has proposed an adequate hermeneutical method of interpreting the Quran. He has discussed his theory in various works including Islam, Islam and modernity and themes of the Quran etc. Many scholars of present day have attempted to analyze his method of interpreting Quran which he laid down in his works. This article suggests a possible approach with which we could understand his thoughts better. For example, to start such an analysis first we have to find whether such a model was ever given before in the Muslim history. If so, what were the conditions then and why we need to rethink about it now? Secondly, we have to find that if such an ijtihad is done, who will decide its credibility? And which issues are worth taking to begin with? These are certain issues which would be considered and discussed in this article.

Iqbal said in his presidential address of All India Muslim League in 1930, while accounting for the dynamism in Islam, "At any critical moment in their history it is Islam that has saved Muslims and not vice versa."[1] It is a crucial question now, more than ever, i.e. to decide how it can be possible in modern times? For while we badly need to refresh and rethink the basic principles of Islam according to changed scenario of our own time, what we have in the name of Islam are the conservative ideas and forces who want to revive, rather relive, the classical era and not ready to move from the fixed body of principles and practices, and the world history has covered a long way from that era and brought a totally new horizon in its sweep. Now it seems difficult and even ridiculous to a conscious man to ignore it altogether. He has to go along with the mainstream of history anyway and this is the true Islamic spirit. The Quran itself indicates that the 'ayat' or the signs of Allah will continue to be unveiled through the passage of time: "We shall show them Our portents on the horizons and within themselves until it will be manifest unto them that it is the Truth."[2]

How then, could a new meaning be obtained if all the possible meanings had been exhausted in the past? Compared to the past, the future is full of unpredictable possibilities by which our understanding of the Quran should interact. Since both the natural world and the Quran have come from the same source and both complement one another, therefore the more one learns about human history and the natural world, the better one grasps the meaning of the Quran. [3]Today most of the Muslim countries are free and the growth of Muslim population has been increasing rapidly. But it seems that in incorporating Islam in our society, we would be left behind as powerless insignificants in the face of modern powers of the world, mostly secular. Now that it seems difficult to save our Islam and yet live prosperously, can Islam save us? i.e. Is there any potential in Islam to cope with the changing times?

Many scholars have attempted to see the potential in Islamic principles in a new light of changing circumstances and

Dr. Fazl-ur-Rehman(1919-1988) is one such name of twentieth century.

He believed that the Quran should be understood as a coherent system and the underlying unity of Quranic text should be realized fully. He condemned the attitude of taking the verses in isolation and fixing their meanings, which has been the common practice of the majority of Muslims and the main reason of the stagnation of thought process in the Muslim world, instead, their actual spirit should be taken. Dr. Fazl-ur-Rehman emphasized that the social evolution in each and every field of the society, eg.status of women and slaves, and moral values in general etc., and everything ordered in Islam is for this end. It must be kept in mind while making laws.[4] Hence for changing the rigid attitude, he proposed an adequate hermeneutical method of interpreting the Quran. This involves a double movement, from present situation to the Quranic times and then back to the present, i.e., first to understand the meanings of the Quranic under specific situations of the time of revelation and drawing general laws from them, and secondly to see these general laws in the light of our present situation. This logical method involves a deep study of the historical context of the Quranic verses as well as a deep insight into our present situation.[5]

No doubt it is a very reasonable theory of interpretation for the Quran but we have to analyse it with certain considerations which we feel necessary to discuss. To start such an analysis, first we have to find whether such a model was ever given before in the Muslim history. If so, what were the conditions then and why we need to rethink about it now? Secondly, we have to find that if such an ijtihad is done, who will decide its credibility? And lastly, which issues are worth taking to begin with? This thesis, therefore, will be started with these questions and then an analysis of Dr. Fazl-ur-Rehman's works in general to find out how successful he has been, to enlighten the modern minds by his efforts.

When we look at the history of Sub-Continent, we find that the three questions, mentioned above, were tackled by Shah

Waliullah (1703-1762), Sir Syed (1817-1898) and Iqbal (1877-1938), respectively.

The solution which Shah Waliullah gave was simple: an independent interpretation of the Quran. In an atmosphere where vigorous campaigns against innovations were going on, and superstitions were prevailing, we can suppose how difficult it had been for him to initiate this. But so strong was his determination that the fresh air he blew through the environment of Sub-Continent, prevails since then.

He was the first person who, after a long time in the Sub-Continent, insisted upon turning towards the Quran and only the Quran for all ills. This is the only book which could stand the tests of all times and an ultimate source of guidance. With this purpose in mind he translated it into Persian as it was then the official language spoken and understood everywhere in India. 'He took this bold and courageous step at the risk of his life, but he did not care for that.'[6] He strongly held that the Quran should be read independent of commentaries, not only to cope with the differences among the schools by thinking ourselves, but more than that, it enables us to bring forth new meanings and ideas. When we read commentaries we understand the Quran but through the age old and sometimes outdated perspectives. But when we read it ourselves, we think about the meaning with our fresh perspective in a much more developed and changed environment, social and intellectual, and hence bring forth new meanings and ideas and this is the only way to break the stagnation.[7]

Hence he found that the free interpretation of the Quran by individuals becomes the first thing needed to move on. He made the Quran his basis so firmly that he showed the traditions also as deducible from the Quran.[8] He believed that there is nothing in the Quran that is beyond human understanding. So everyone should study it with meditation on his own. But so many preliminaries are regarded as the requisites of studying the Quran that the real teaching is difficult to be imparted in our institutions. Shah Waliullah, therefore, wanted to treat them as mere preliminaries and not to give them equal importance, as they tend to take the place of the study of the Quran itself. In this way his strict fundamentalism, as Dr. Aziz Ahmed calls it,[9] reduced the rigidity of the four schools of Fiqh, as Muslims had started thinking independently and therefore the strict boundaries were started to vanish.

He also found that although religious scholars had regarded the Quran as the primary source of Fiqh, but practically they kept their focus only on the Quranic do's and don'ts, rather than discussing it as a whole. The result was that people in general kept their focus only on halal and haram, and not took it as a source of moral grooming of their whole personality.

For instance, it was agreed by majority of scholars though, that if a certain verse of the Quran is revealed in general meaning then even if the interpreters refer to some special event in its background, it would be considered general in its meanings. But when we see the interpretations, we find that they have given such events with almost every verse and not only this, they have restricted every individual verse to some particular person or event and therefore made it a trend to meditate over those particular events more than the actual verse.[10]

Keeping the Quran as a book of do's and don'ts, and restricting its meanings to particular events, resulted in creating an atmosphere where the Quran practically became ineffective in people's life. It was left to recitation only. In Al-Fozulkabir, Shah Waliullah pointed out this grave fault and emphasized that instead of any particular events, those qualities and behaviors, in general, should be taken as the proper background of the verses that were mere exemplified by the particular persons and events. They were revealed for all men, whether Arabs or non-Arabs, till the end of times, so that whenever and wherever such things happen, these verses will be applied and they are actually meant for those situations. For in this way only, the Quran could be workable for every new generation, all over the world, and we know that it is so as it is the last message revealed to a Prophet. Shah Waliullah said: "It is confirmed that whenever evils and oppressions exist, it would be supposed to be the back ground of these verses."[11]

Now, to read the Quran as a whole and in a proper way, he gave some simple principles in his book Al-Fozulkabir. He divided the meanings and content of the Quran in five categories and emphasized that nothing in the Quran is beyond these five. Among them is, first of all, Ilm-ul-ehkam (the study of imperatives) _it explains the dos and don'ts in our daily life and in the life of states etc. Then comes Ilm-e-behsomubahisa (the study of discussions and comparisons). In it, the Quran argues with four wayward nations, i.e. Jews, Christians, Mushrikin and Munafiqin. But Shah Waliullah believed that these four are taken as examples of those nations who deviate from their right path, anywhere and whenever. We should not consider them as addressed to those four only, but it speaks to all the nations till the end.

Then, thirdly, there is the study of nature and the signs of Allah. It requires a scientific knowledge of course to discuss it. Fourthly, Ilm-e-Tazkir bi ayyam Allah (study of history), the Quran narrates historical events. Shah Waliulah believed that these should be taken as examples and could be imposed in any similar event.

Lastly, there is Ilm-e-tazkir bilmot-o-baaduhu (study of death and here after).[12]

Taking all the five studies or topics of the Quran, we could groom our whole personality into a morally sound one and no corner of our life would be left untouched. He said that the Quran describes the events of history and the good or bad results of those events, as well as the references of life after death; all these are to point towards good and bad attitudes in our lives and to train us. That is why these events are not described wholly in a story like manner, but only secondarily as required for a particular injunction stated in a particular verse. He made the understanding of the Quran so simple and easy for anyone who wants to read it. As well as the concept of the Quran as a universal book for all times and people was revived, which was practically forgotten in the sub-continent.[13]

Then, after almost a century, we see that Sir Syed raised this issue once again and also the question that who decides its credibility. He believed that the answer lay in a consensus of the whole Muslim Community of India, for he regarded it an un-transferable right of every individual Mulim and he totally rejected the idea of restricting it to the religious scholars only and to keep the masses away from the decisions about religious matters. Every Muslim has to study Arabic as well English sciences in order to think maturely and to develop a mutual understanding.

Sir Syed was facing a very different situation from Shah Walliullah. After the decline of Mughal Empire, under the rule of the British government, the atmosphere completely changed. Sir Syed appreciated the change and clearly perceived the political realities in the new context. We lost the strength not because of our political weakness but because of our moral laxity and intellectual bareness.[14] A flood of new inventions and scientific progress was poring in while the Muslims were left behind, partly because of the prejudice which the British had as they thought of them as their adversaries, and partly because of the unwillingness of the Muslims to learn new language and studies. In such a crucial time, the enlightened people like Sir Syed were sensing the miseries of the Muslims in that time as well as in the time to come. They regarded the lack of modern knowledge as the biggest cause. Sir Syed was worried about the gap between the facts about the experiences of the modern sciences and the prevailing facts about the revealed religion,[15] out of which the latter was a result of a lack of Quranic understanding. The strength of the west appeared to him to be lying in its liberalistic rationalism. The attempted reconstruction of the society thus involved interpreting Islamic concepts in rational terms. Sir Syed laid down the principles of his interpretations of the Quran on the apriori identity of reason and revelation. He took 'Wahy' (revelation) and 'natural laws' to be identical.[16] In such a situation, he suggested, either we should refute the modern philosophy with logic and reason, or show that our religion is not against the modern science, for this has always been done in the Muslim history whenever they face a situation when foreign literature seems to dominate their own culture. It seems difficult though, but it would become easy if we sit together and develop a mutual understanding.[17] He therefore emphasized on interpreting the primary sources of Islam according to the modern thought independent of the early legists. It involved the problems of evaluating the western civilization, rationalization of basic data of faith and recasting it on the model of early rationalists of Islam. His pragmatic approach assumed a deeper significance. He strongly denied that Islamic principles are in any way against or incompatible with Victorian values and ideals.[18]But his innovative thoughts are traced back to Shah Waliullah, rather than western rationalism. Almost unlimited ijtihad as the 'in-alienable right' of every individual Muslim; rejected the concept of ijma confined to the Ulama only.[19]Now, the problem was how to do that, for the Muslims were totally indifferent and ignorant of each other's condition in India, although all of them were experiencing the same plight.

Sir Syed developed this through his philosophy of love. He believed that love is the basis of a community, which starts with a feeling of oneness with our own community, and gradually grows out to feel oneness with the whole mankind, and then a love for the whole universe, for then, it becomes clear that the whole universe is a creation of One God.[20] 'I am the soul of the whole mankind', the bride in the dream of the old man in, in Sir Syed's symbolic short story "Guzra hua Zamana"[21], and it was insisted that to get this bride should be our aim. That stage of love should be our ultimate destination, but if that was too far at the moment, what they could do at the least was to be one with their own community.

"From meeting each other, and discussing different issues related to religions education and national progress, we will necessarily get a better way to solve them".[22]

Hence exchange of views and consensus will decide in the matters of dispute. The most crucial disputed matter was that the Muslims were showing hatred and indifference towards modern sciences and regarded them as against their religion. Sir Syed regarded it as a misunderstanding in grasping the real spirit of our religion. In order to develop a proper understanding of religion, thus, and to prepare them to meet the challenges of modern philosophy and culture, he regarded education and only education as a means to progress.[23]

He took practical steps in both the directions, i.e. to collect the Muslims together, and to educate them. He invited the representatives from all over India, and laid the foundation of Scientific Society in Ghazipur, on Jan 9, 1864, which was aimed at translating English and French works into Urdu. But this was not enough, and he laid the foundation of a Madrassah in Ghazipur where Arabic, Persian, Sanskrit and Urdu along with English were taught. This Madrassah soon turned to be a College and then University.

The crux of his thoughts, therefore, is:

1. Love is the basis of a community, which is a starting point and gradually turned into the love of the whole mankind and then all living beings and ultimately of the whole universe.
2. Muslims should learn English Sciences without abandoning Arabic and Persian. For there is nothing in the Quran that is incorrect or contradictory to natural science.
3. Islam is not against Christianity but the modern philosophy.

This set the trend of literary works, political discourses, religious ijtihad and education and morals, for the next few centuries.[24]

Finally, the diverse currents of ideas agitating the minds of modern Muslims found their expression in Iqbal's thought. We find Iqbal as the culmination of the intellectual quest, of the British India's Muslim Community, for interpreting the Quran with fresh perspectives and to see the deeper and vaster aim of Islam_ to reconcile the tension and antagonism between the natural world and Islamic laws, and to reconstruct a new world if the older one is not doing well, according to the Will of God.[25] He explains and emphasized on rational thinking in his poetry as well as his prose. In his famous lectures, "The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam", while explaining that the Scientific knowledge i.e. given by sense-perception is not essentially distinct from intuition i.e. the dictates of heart, he says that through sense-perception we acquire knowledge of those external forces so that we can tame them, but when those forces thwart us we need a capacity "to build a much vaster world in the depths of [our] inner being",[26] which could save us from pessimism. Also, it will prevent us from using our power to unfair ends.[27] He also dreamt for the emancipation of Muslims as well as the whole humanity from all sorts of bounds, whether cultural or traditional. He says, "As a cultural movement Islam rejects the old static view of the universe, and reaches a dynamic view. As an emotional system of unification it recognizes the worth of the individual, as such, and rejects blood-relationship as a basis of human unity."[28] He also saw the decline of rational thinking, which is encouraged in the form of Ijtihad in Islam and which Iqbal calls the principle of movement in the structure of Islam, as the basic reason of the decline of the Muslims as a whole. May it be as a conservative reaction against Rationalism; ascetic Sufism, which absorbed the best minds of the Muslim society and left the legal discussions in the hands of "intellectual mediocrity and the unthinking masses";[29] or as a fear of disintegration in the time of decline. He saw only two distinctions as to revive ijtihad in the later Muslim history i.e. Ibn-e-Taimiyyah's revolt against the finality of the earlier schools (resulting in the Wahabi's movement in Arabia), and the religious reform movement in Turkey which upholds the transfer of the Caliphate from an individual to an assembly.[30] He admitted that the conservative public in modern India may not be prepared for a critical discussion on fiqh, but it must be remembered that there was no written Islamic law up to the rise of the Abbasids, and the early theologians also passed from deductive to inductive methods in their efforts to answer the questions of their times. Moreover, we must see that the possibility of further evolution of the Islamic law becomes evident when we carefully look at its four sources: (a) Quran, which is not a legal code but rather aims to "awaken in man the higher consciousness of his relation with God and the universe."; [31](b) Hadith, which mainly demonstrates examples of how the Prophet applied the broader principle to a specific socio-cultural context; (c)Ijma(the consensus), which may be imparted to a democratically elected assembly in a modern Muslim state; and (d) Qiyas(analogical reasoning), which is just another word for ijtihad.[32] Hence, even if some later doctors have even favored the myth of ‘closing the door of ijtihad’, “modern Islam is not bound by this volunteer surrender of intellectual independence.”[33]

We see a blend of Shah Waliullah and Sir Syed’s thoughts in Iqbal. He was living in a time period when India was about to be independent, and he was thinking about the issues which were the most crucial for the Muslims to decide and to have a consensus upon. First of all, they must decide what they mean by the Muslim Community, does it mean the whole Muslim world, or a nation-state of dominant Muslim majority? In his sixth lecture in the “Reconstruction of Religious Thoughts in Islam”, he has pointed out this by giving example of Turkish Ijtihad over the issue of Khilafat: Should the Caliphate (or the government) be vested in a single person? (What should be the form of government in modern time?). The Turks have found the solution that it can be vested in a body of persons or elected assembly. However, “The religious doctors of Islam in Egypt and India, as far as I know, have not yet expressed themselves on this point.”[34] Iqbal felt that the Turkish solution is the best for us today, for they believed the concept of Khilafat was rooted in its workability. It was workable when the Empire of Islam was intact, but it is now failed. Hence, Iqbal concluded, workability should be the basis of our solutions.

Another issue Iqbal regarded as crucial to be settled and redefined immediately was the issue of Family Laws. He said that the Quran lays down legal rules on social and family matters while it is not a book of Laws, just because contrary to Christianity, which forgot the State, Society, and Family relations in search of acquiring other worldiness, the Quran considers it necessary to unite religion and state, ethics and politics in a single revelation.[35] Iqbal did not mention particular issues but being an advocate, he was fully aware what difficulties the Muslims faced when the family disputes were solved according to old Hanafi laws. His deep concern could be sensed when he says: “Does the working of the rule relating to apostasy, as laid down in the Hidaya, tend to protect the interests of the Faith in this country?”[36]“Dr. Khalid